بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

کسی نظریہ کی صحت کو عام طور پر دو طریقوں سے جانچا جاتا ہے۔ عقل و استدلال کی کسوٹی پر پرکھ کر یا اس کے عملی نتائج دیکھ کر۔ انسانی تجربات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اکثر و بیشتر صحیح نظریہ استدلال اور نتائج دونوں اعتبار سے انسان کے لیے اطمینان کا باعث ثابت ہوتا ہے لیکن دنیا میں ایسے نظریات کی بھی کمی نہیں جو عقل و استدلال کے نقطہ نظر سے اپنے اندر بڑی کشش رکھتے ہیں لیکن جب وہ عملی زندگی کے سانچوں میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں تو اتنے بھیانک معلوم ہوتے ہیں کہ انسان انہیں دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اسی طرح بعض نظریات ایسے بھی ہیں جنہیں عقل کے نمائشی پرستار پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے لیکن جب وہ پیکر محسوس میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو انسانوں کی اکثریت ان کی صحت اور عظمت کی قائل ہو جاتی ہے۔ ہم ان تینوں اقسام کے نظریات کی وضاحت کے لیے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ آپ نظریۂ توحید پر غور کریں۔ اس میں عقل و استدلال کے اعتبار سے بھی بڑی کشش اور جاذبیت ہے اور انسانی قلب و دماغ کو اس نظریہ کے اپنانے سے سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ پھر جس معاشرے نے بھی اس بنیاد پر اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر کی ہے اس کے سارے مسائل بطریق احسن حل ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس معاشرے کے اپنے ارکان اور باہر سے مشاہدہ کرنے والے دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہیں کہ اگر جنتِ ارضی کہیں موجود ہو سکتی ہے تو وہ یہی خطہ ہے جس میں توحید اور رسالت کو رہنما اصول مان کر اس کے مطابق زندگی کی تشکیل کی گئی ہے۔

نظریات کی دوسری قسم یعنی جو اپنے اندر بظاہر بڑی جاذبیت رکھتے ہیں مگر عملی میدان میں انسانیت کو تباہ و برباد کرتے ہیں، مادی تہذیب کے افکار و تصورات میں بڑی آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً پیدائش دولت اور صرف دولت کی آزادی۔ بادی النظر میں تو یہ اصول بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معیشت پر کسی قسم کی پابندی

عائد نہ کی جائے ۔ ایک انسان اپنی ذہانت اور فطانت کے بل بوتے پر جس طرح چاہے اور جس قدر چاہے کمائے اور اپنی اس دولت کو جس انداز پر چاہے خرچ کرے اور کوئی اس سے باز پرس کرنے والا نہ ہو۔ نظریہ کی حد تک تو اس میں کافی حد تک کشش نظر آتی ہے ۔ کیونکہ آزاد معیشت بھی انسانی آزادی کے پیدائشی حق کا ایک لازمی حصہ ہی ہے ۔ جب انسان آزاد پیدا ہوا ہے تو اس حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ معاشی دائرے میں بھی اس پر کوئی قدغن نہ لگائی جائے ۔ چنانچہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد اسی اصول کو بڑے شد و مد کے ساتھ اپنایا گیا لیکن چند سالوں کے بعد ہی جب اس دلفریب نظریے کے روح فرسا نتائج سرمایہ داری کی صورت میں سامنے آئے تو پوری انسانیت تڑپ اٹھی اور اس نے اس آزادی کو یکسر سلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

نظریات کی تیسری قسم ــــ وہ نظریات جو بظاہر تو دلکش دکھائی نہیں دیتے مگر درحقیقت انسانی فوز و فلاح کے ضامن ہوتے ہیں سب زیادہ تر مذہبی دوائر میں دیکھی جا سکتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی نظریات چونکہ انسانی عقل کی پیداوار نہیں ہوتے بلکہ خالق کائنات کی طرف سے عطا کیے جاتے ہیں اس لیے انسان کی محدود عقل بسا اوقات ان کی قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتی ۔ ٹھوس نتائج سامنے آنے ہی سے ان کی حقیقی افادیت کا راز کھلتا ہے ۔ مثال کے طور پر آپ اسلام کے عائلی قانون تعدد ازدواج کو ہی لیجیے ۔ اس اصول کے ذکر ہی سے عقلیت پرستوں کی جبینیں شکن آلود ہو جاتی ہیں اور وہ اسے وحشیانہ طرز زندگی کی ایک بھیانک یادگار سمجھتے ہوئے اس پر طعنہ زنی شروع کر دیتے ہیں لیکن انسان کی معاشرتی زندگی کی پوری تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ آج تک جن انسانی معاشروں نے زنا، صحبت ہم جنس اور اسی طرح کے دوسرے معائب سے اپنے آپ کو پاک رکھا ہے یہی وہ معاشرے تھے جنہوں نے تعدد ازدواج کے اصول کو پوری خوشدلی کے ساتھ اپنایا ۔ اس حقیقت کا اظہار کسی مسلمان مفکر یا مؤرخ نے نہیں کیا بلکہ ان اہل علم نے کیا ہے جو اس گروہ سے متعلق ہیں جن کے نزدیک عائلی زندگی میں تعدد ازدواج سے زیادہ کسی دوسرے سنگین جرم کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا ۔ اگر آپ کو اس کی تصدیق مطلوب ہو تو انسائکلوپیڈیا آف ریلیجن اور ایتھکس کے اندر "شادی" کے ذیل میں اسے خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں ۔ یہ دائرۃ المعارف جن لوگوں کی زیر نگرانی تیار ہوا ہے، ان کی " اسلام دوستی " سے بھی پوری دنیا آگاہ ہے ۔

یورپ میں گذشتہ چند سالوں سے صنعتی انارکی کا جو خوفناک طوفان اٹھا ہے اس کی تہ میں آزادی اور

حریت کے دلفریب نظریات ہی کام کر رہے ہیں۔ اس طوفان کا آغاز بھی دیگر طوفانوں کی طرح بادِ صبح کے لطیف جھونکوں سے ہوا لیکن اس نے جلد ہی ایک نہایت وحشتناک صورت اختیار کر لی۔ پہلے تو اس ناقابلِ تردید حقیقت کا پرچار شروع ہوا کہ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ پھر اس حق کی بنیاد پر آزادیٔ نسواں کی تحریک شروع کی گئی اور اس طرح عورتوں کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر خارجی زندگی کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش لاکر کھڑا کیا جانے لگا۔

پھر آزادی کے مفہوم میں بھی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس انداز کی معنویت پیدا کی گئی جس سے عورت ایک کمانے والے کا رکن کے علاوہ مرد کے ہاتھ میں ایک ایسا کھلونا بن کر رہ گئی جس کی تخلیق کا واحد مقصد مرد کے صنفی جذبات کی تسکین قرار پایا۔ انسانیت کو اس غلط رُخ پر تیزی کے ساتھ آگے بڑھانے کے لیے آزادی کی آڑ میں نہایت گمراہ کن فلسفے گھڑے گئے۔ فرائڈ نے ایک خاص حد تک صحیح اور معقول بات سے غلط نتائج اخذ کرکے آزاد شہوت رانی کے لیے فضا ہموار کی۔ انسان کے اندر جنسی خواہش کا وجود ایک مسلم حقیقت ہے، پھر یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح اور درست ہے کہ اگر اس خواہش کی تسکین کا خاطر خواہ انتظام نہ کیا جائے تو اس سے انسان کے قویٰ کافی حد تک متاثر ہوتے ہیں۔ خصوصاً ذہنی خلفشار کی وجہ سے انسانی صلاحیتیں نکھرنے نہیں پاتیں اور وہ مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہ ساری باتیں اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں اور کوئی معقول انسان ان کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر فرائڈ بھی اس انداز سے سوچتا اور غور کرتا اور انسان کی صنفی جبلت کو اُس کے فطری حدود میں رکھنے کے لیے کوئی صحت مندانہ تجاویز پیش کرتا تو یہ نوعِ بشری پر اس کا بہت بڑا احسان ہوتا لیکن بدقسمتی سے اس نے آزادی کے صحیح مضمرات کو سمجھے بغیر یہ رائے قائم کر لی کہ انسانی عمل کا سب سے طاقتور محرک صنفی میلان ہی ہے اور اگر اس بپھری ہوئی داخلی قوت کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کر دی جائے یا اسے بعض ضابطوں کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے تو انسان کی شخصیت تباہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے انسان کے صحیح نشوونما کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی جبلت کو اپنی تسکین کے لیے کھلے مواقع فراہم کیے جائیں اور اس راہ میں وہ جو قدم بھی اُٹھائے اس پر نیک و بد یا محمود و مذموم کا کوئی حکم لگا کر یا جنت کی بشارتوں اور دوزخ کی صعوبتوں سے مرعوب اور خوفزدہ

کرکے اس کے ذہن کو اس بارے میں قطعاً متاثر نہ کیا جائے کیونکہ اگر وہ اس نوعیت کے "غلط اثرات" کے تحت اپنے آپ پر کوئی پابندی عائد کرے گا تو وہ متعدد ذہنی عوارض کا شکار ہو جائے گا۔

صنفی جبلّت جب ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوگئی تو سیلاب کی طرح اس کی یلغار کا بھی کوئی متعین راستہ موجود نہ رہا۔ اس نے جس طرف چاہا بلا روک ٹوک آگے بڑھ کر مذہب و اخلاق کی لہلہاتی کھیتیوں کو برباد کرنا شروع کر دیا اور اب حال یہ ہوگیا کہ وہ لوگ جو آزاد شہوت رانی کے فلسفے کے پرچارک تھے وہ بھی اس اندوہناک صورت حال پر سخت مضطرب نظر آتے ہیں اور اس بات کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ انہیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ آزادی کا یہ فلسفہ کس نوعیت کے تباہ کن نتائج پیدا کرے گا۔ امریکہ کے معروف ماہنامے میں "امریکہ میں طلاق" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس سے ان لوگوں کی ذہنی پریشانیوں کا کسی حد تک مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

برٹرنڈرسل اور سگمنڈ فرائڈ دونوں کو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ صنفی جبلّت پر ناروا پابندیوں جو زیادہ تر کم علمی اور رسم و رواج کی پیداوار ہیں، نے عائلی زندگی میں دکھ بھر دیے ہیں۔ اس لیے دونوں اس بات کے آرزو مند تھے کہ زندگی کے اس دائرے میں ردّعمل پیدا ہو۔ چنانچہ یہ ردّعمل فی الحقیقت ظاہر ہوا لیکن انہیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ یہ گھڑی کے رقاص کی طرح اس شدت کے ساتھ مخالف سمت کی طرف بڑھے گا کہ اس سے معاشرے کا پورا ڈھانچہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ ان مفکرین نے تو اجتماعی مسائل کے بارے میں جہالت اور صنفی جذبات پر ظالمانہ پابندیوں اور عائلی زندگی میں منافقانہ روش کے خلاف جدوجہد شروع کی تھی — اور اس میں انہیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے لیکن افسوس اُن کی اس کامیابی نے آزادی کی صورت اختیار کرنے کے بجائے اباحت مطلقہ کی بھیانک شکل اختیار کر لی ہے۔

فاضل مضمون نگار بڑے دکھ کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ انسانی محاسن مثلاً شرافت، پاکدامنی، شرم و حیا سب بڑی تیزی کے ساتھ مغربی معاشرے سے حرف غلط کی طرح مٹائے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ فسق و فجور کا تسلط قائم ہو رہا ہے۔ صنفی جبلت نے محرک کی صورت چھوڑ کر جنون کی کیفیت اختیار کر لی ہے اور انسان نے اس جنون کے زیر اثر رشتۂ مناکحت توڑ کر اور اس کے تقدس کو پامال کر کے آزاد شہوت رانی کو اپنا

دلپسند مشغلہ بنالیا ہے۔

جب کوئی قوت حدود و قیود کی پابند نہ رہے اور جذبہ جنون کی صورت اختیار کر کے ہو، بیٹیوں کی قبائے عفت تار تار کرنا شروع کر دے تو اس دیوانگی میں عالم میں انسانوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ ایک خاص حد پر آکر خود بخود رک جائیں گے، انتہائی نادانی ہے۔ ایک فرد جس طرح جنونی کیفیت کے تحت آپے سے باہر ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح معاشرہ بھی جنون کے زیر اثر شائستگی کی ساری حدود پھلانگ جاتا ہے بلکہ اپنی اس ذلیل حرکت کو ہی وہ بڑی کامیابی خیال کرتا ہے۔ یہی حال مغربی معاشرے کا بھی ہوا ہے۔ جب شہوت رانی کا طوفان اٹھا تو معاملہ مرد و زن کے باہمی تعلقات کے بگاڑ تک محدود نہ رہا بلکہ صحبت ہم جنس نے ایک انتہائی خوفناک وبا کی صورت اختیار کر لی اس سے انسانی صحت، اخلاق اور عائلی زندگی کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مرض دنیا کے مہذب ممالک میں کس قدر سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے اس کا ایک جائزہ حال ہی میں امریکہ کے مشہور ہفت روزہ ٹائم میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ نگار کے تجزیے کے مطابق یہ وبا برق رفتاری کے ساتھ امریکی معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ آج سے پچیس برس پیشتر جب کینزے نے امریکہ کی اخلاقی حالت کا جائزہ پیش کیا تو اس کے مطابق اس وقت عورتوں میں صرف ایک سے دو فیصد خواتین اس مہلک مرض کا شکار تھیں اور مردوں میں ۱۳ فیصد افراد اس فساد میں گرفتار تھے۔ اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ امریکہ کے دو کروڑ باشندے فخر و مباہات کے انداز میں اپنے اس "کارنامے" کا کھلے بندوں تذکرہ کرتے ہیں اور اس میدان میں ان کے حوصلے اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ انہوں نے سیاسی جماعتوں کی طرح اپنے آپ کو مختلف تنظیموں کے تحت منظم کرنا شروع کر دیا ہے اور یہ تنظیمیں روز بروز قوت حاصل کرتی چلی جا رہی ہیں اور ان کی وجہ سے امریکہ کے اندر فشاری گروہ معرض وجود میں آ رہے ہیں جن کے دباؤ میں آکر امریکہ کی کئی ایک ریاستیں اس گھناؤنے جرم کے لیے قانونی جواز فراہم کرنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔

معاملہ صرف قانونی جواز تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس انسانیت سوز جرم کے بارے میں اہل علم کے فکر و نگاہ کے زاویوں میں بھی بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ مغرب کے ملحد اگرچہ اخلاقی نقطہ نظر سے اس جرم کو پہلے بھی کوئی زیادہ معیوب نہ سمجھتے تھے مگر وہ اس بات کے ضرور قائل تھے کہ جو لوگ بھی اس جرم کا ارتکاب

کرتے ہیں وہ نفسیاتی مریض ضرور ہیں اور اگر اُن کے اس مرض کا مداوا کر دیا جائے تو وہ صحت یاب ہو سکتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں ماہرین نفسیات اس جرم کو ایک نفسیاتی عارضہ بہر طور تسلیم کرتے تھے لیکن یہ ان رنگین اور آوارہ مزاج نوجوانوں جنہیں امریکہ میں اب " GAYS " کے لفظ سے پکارا جاتا ہے، کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ذہنی عوارض کے اطباء نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ گھناؤنا جرم کسی ذہنی عارضہ کی غمازی نہیں کرتا بلکہ ایک صحت مند شخص بھی اس میں ملوث ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اساتذہ کے ایک خاص جریدے میں جس کا نام کالج انگلش" ہے مدیر کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ اساتذہ کو اپنے تعلیمی فرائض کا احساس کرتے ہوئے ان سارے تجربات کو اپنے طلبا کے سامنے لانا چاہیے جو اُنہیں اس فعل کے سلسلے میں حاصل ہوتے ہیں تاکہ جو نوجوان اس مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہیں ان کے دل سے احساس گناہ مٹ جائے اور ان کے اندر ضمیر کی کوئی خلش باقی نہ رہے۔

جو فعل صدیوں سے اپنے ساتھ گناہ کا ایک خوفناک اور بھیانک تصور لیے آ رہا ہے اس فعل کے بارے میں لوگوں کے اندر یہ تاثر قائم کرنا کہ یہ ایک معصوم سی تفریح" ہے، کوئی آسان کام نہیں۔ امریکی والدین نوجوانوں کی اس روش سے سخت نالاں ہیں۔ انہیں اس امر کا پوری طرح احساس ہے کہ اگر معاشرے میں یہ فعل ایک جرم کی حیثیت سے موجود رہے تو اس کے مٹانے کی تدابیر ہو سکتی ہیں اور لوگوں کے اندر اس کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات بیدار کر کے اس کی کسی حد تک روک تھام ممکن ہے۔ لیکن اگر یہ بُرائی، بُرائی نہ رہے بلکہ عوام کے نزدیک یہ ایک جائز فعل قرار پا جائے تو پھر اس کے اثرات کو زائل کرنا قریب قریب ناممکن ہو جائے گا۔ کوئی ریاست یا معاشرہ یا انسانوں کا اجتماعی ضمیر بُرائی کا تدارک تو کر سکتا ہے لیکن اگر اس بُرائی کو بُرائی نہ رہنے دیا جائے تو پھر اس کے خلاف جد و جہد کی کوئی موثر صورت باقی نہیں رہتی۔

اس گھناؤنے فعل کے مرتکبین کو مندرجہ بالا حقیقت کا پوری طرح احساس ہے چنانچہ ان کی ساری جد و جہد آجکل صرف اس نقطہ پر مرکوز ہے کہ اس جُرم کو کسی طرح جُرم کے زمرے سے نکال کر " تفریح" یا " دل لگی " کے زمرے میں شامل کر دیا جائے اور عوام کے ذہنوں میں اس کے خلاف نفرت کے جو جذبات موجود ہیں وہ ختم کیے جائیں۔ اس مذموم مقصد کے حصول کے لیے وہ سارے حربے اختیار کیے جا رہے ہیں جو عام طور پر بد کردار لوگ

اپنے جرم کی خفت مٹانے کے لیے کرتے ہیں۔ آپ روزمرہ زندگی میں کسی شرابی یا مرتشی کے طرز عمل کا جائزہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کوئی مجرم ضمیر جب پہلی بار کسی اخلاقی حد کو توڑتا ہے تو اس کے اندر احساس ندامت پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے جرم کو عوام سے چھپانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ لیکن جرم کے مسلسل ارتکاب سے ایک طرف تو اس کا ضمیر مُردہ ہوجاتا ہے دوسرے اُسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اب لوگوں کو میری بداعمالیوں کا علم تو ہوگیا ہے اس لیے انہیں چھپانا بیکار ہے۔ چنانچہ جرم کے ارتکاب کے معاملہ میں زیادہ جری اور احساسات کے معاملے میں حیا سے عاری ہوجاتا ہے اور پھر ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ جذبۂ تفاخر کے ساتھ اپنے اِن جرائم کا اس انداز سے اظہار کرتا ہے گویا کہ اس نے کوئی بہت بڑی فتح حاصل کی ہے۔ یہی حال یورپ کے ان نوجوان مجرموں کا ہے وہ جب بھی اکٹھے ہوتے ہیں تو مبارک اور سلامت کے پیغامات کے ساتھ اپنے ان گھناؤنے افعال کا ذکر کرتے ہیں اور جو لوگ اس عادت بد کا شکار ہیں انہیں قوت کے زور سے اس بات کے لیے مجبور کرتے ہیں کہ وہ کھل کر سامنے آئیں اور فخر سے سر اُونچا کر کے ببانگ دہل لوگوں کو اپنے ان "کمالات" سے آگاہ کریں۔ جو حضرات علم النفس سے تھوڑی سی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اپنی بُرائی کی تشہیر کا یہ انداز کسی گہرے اضطراب کا پتہ دیتا ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ ایک شخص خواہ وہ الفاظ کی صورت میں کچھ ہی کہے مگر زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ میں اپنی نظر میں، خاندان اور برادری کی نظر میں، معاشرے کی نظر میں بلکہ پوری انسانیت کی نظر میں ایک ایسی پست سطح پر اُتر چکا ہوں جس سے نیچے کسی دوسری سطح کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے میں نے خود بھی اور اہل دنیا نے بھی میری ذات کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ جس بیباکی کو یہ لوگ اپنی انا کی ظفرمندی خیال کرتے ہیں وہ درحقیقت اپنی اخلاقی موت کا اعتراف ہوتا ہے اور اپنی جس بُرائی کو وہ بظاہر خوشی اور مسرت کے اُبلتے ہوئے جذبات کے ساتھ بیان کرتے ہیں اُن کے سوتے یاس وقنوطیت سے پھوٹتے ہیں۔ مجلسی تبسم ضروری نہیں کہ ہر حال میں شادمانی کا نتیجہ ہو۔ بسا اوقات چہرے پر کھیلنے والی مسکراہٹ اپنے اندر گہرے درد کو بھی سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ چونکہ امریکہ کے بعض بدکردار افراد اپنی بدکرداری کو فخریہ انداز میں بیان کرنے لگے ہیں اس لیے اس بدکرداری نے نیکی کا روپ دھار لیا ہے، بالکل غلط ہے۔ البتہ ایک بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ اہل یورپ اخلاقی اعتبار سے پستی کے اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں انسانی ضمیر مُردہ ہوجاتے ہیں اور افراد مایوسی کی تصویر بن کر اچھائی اور بُرائی کا امتیاز کھو دیتے ہیں۔ چنانچہ امریکہ کے آوارہ مزاج نوجوان وہاں کے بوڑھوں کو ترغیب وترہیب کے ذریعے اس بات پر آمادہ کر رہے ہیں کہ (باقی بر صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات) وہ عملِ قومِ لوط کے متعلق اپنے ذاتی تجربات سے عوام کو آگاہ کریں۔ برائی کے اس پرچار نے باقاعدہ ایک مہم کی صورت اختیار کر لی ہے اور اس کے زیر اثر آکر بعض بڑے نامور لوگ خود اپنی مٹی پلید کر رہے ہیں۔ حال ہی میں ڈاکٹر ہارورڈ براؤن نیویارک یونیورسٹی کے شعبہ طب کے پروفیسر نے نمک مرچ لگا کر اپنے گھناؤنے تجربات بیان کیے ہیں۔ اس پروفیسر کے ساتھ سینٹ کے متعدد ارکان، یونیورسٹیوں کے اساتذہ، کارخانہ دار اور اعلیٰ سرکاری افسر بھی اس مہم میں شریک ہیں اور وہ اپنے اس جرم کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں گویا کہ یہ کوئی بڑا قابلِ قدر کارنامہ تھا جو اُن کے ہاتھوں سرانجام پایا ہے۔ اگر کوئی ادارہ اپنے کسی کارکن کی اس مذموم حرکت پر اُسے ٹوکتا ہے تو ادارے کے سارے ملازمین اس کے خلاف ہڑتال کر دیتے ہیں اور پلے کارڈ پر نہایت حیا سوز نعرے لکھ کر یہ آبرو باختہ لوگ سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور اپنے جرم کا پوری ڈھٹائی کے ساتھ اعلان کر کے اسے اپنی قوت کا مظہر خیال کرتے ہیں۔